قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

دیں کی نصرت کیلئے اک آسماں پر شور ہے | عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا | اب گیا وقت خزاں آئے ہیں پھل لانے کے دن

ہر سوموار اور جمعرات کو قادیان سے شائع ہوتا ہے

قیمت ہندوستان میں سالانہ ۵ روپیہ

الفضل

دنیا میں ایک نبی آیا پر دنیا نے اسکو قبول نہ کیا۔ لیکن خدا اسے قبول کریگا اور بڑے زور آور حملوں سے اسکی سچائی ظاہر کر دیگا۔ (الہام حضرت مسیح موعود)

فہرست مضامین

مدینۃ المسیح۔ امریکہ میں اشاعت احمدیت ص۱

نامہ لنڈن ص۲

اسلام اور حریت و مساوات ص۳

مضامین بنام ایڈیٹر

کاروباری امور کے متعلق خط و کتابت بنام مینیجر ہو

ایڈیٹر:۔ غلام نبی ☆ اسسٹنٹ۔ مہر محمد خان

نمبر ۴۶ | مورخہ ۲۰ر دسمبر ۱۹۲۰ء | مطابق ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۹ھ | جلد ۸

مدینۃ المسیح

حضرت خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بخیریت ہیں۔

آپ کے مہمانوں کے آرام و آسایش کے لئے پہلے ہی انتظام کیا گیا ہے کہ امرتسر سٹیشن پر ہمارے آدمی موجود ہونگے۔

بٹالہ حسب سابق مہمانوں کے لئے انتظام ہوگا۔

انتظام جلسہ کے اندرون قصبہ افسر اعلیٰ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب ایم اے اور بیرون قصبہ حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحب ہونگے۔

دارالعلوم مفصلہ ذیل جماعتیں اُتریں گی۔ ضلع گورداسپور۔ ضلع سیالکوٹ۔ ضلع گوجرانوالہ۔ ضلع لائل پور۔ ریاستہائے۔ ضلع سرگودہ۔ شاہ پور۔ جھنگ۔ ضلع منٹگمری۔ ضلع جالندھر۔ ہوشیارپور۔ ضلع لاہور۔ ضلع جہلم۔ شملہ۔ کانگڑہ۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔ کوہاٹ۔ بنوں۔ ضلع شیخوپورہ۔ کشمیر۔ جموں۔ بہاولپور۔ کالیوٹ۔ ضلع لدھیانہ۔ انبالہ۔ انکے سوا باقی اندرون شہر اُتریں گی۔

امریکہ میں اشاعتِ احمدیّت

جناب مفتی صاحب کی تازہ چھٹی

دو اور عیسائی مسلمان ہوئے

الحمد للہ کہ تبلیغ اسلام کا کام اس ملک میں ہر طرح سے کامیاب ہو رہا ہے۔ بذریعہ لیکچروں کے اور اخباروں میں مضامین دینے کے دین متین اسلام کی تائید کی جاتی ہے۔ اور لوگوں کے شکوک دُور کئے جاتے ہیں۔ بعض نو مسلموں نے نماز عربی میں یاد کر لی ہے۔ بعض ہنوز انگریزی میں پڑھتے ہیں۔ عاجز نیویارک سے شکاگو میں آگیا ہے۔ جو نسبتاً ملک کے وسط میں ہے۔ اور یہاں سے ہر طرف تبلیغ بآسانی ہو سکتی ہے۔ شہر سوا درلی انس سے خط آیا ہے کہ وہاں کے لوگ عاجز کو لیکچروں کے سلسلہ کے واسطے بلانا چاہتے ہیں۔ گذشتہ رپورٹ کے بعد مفصلہ ذیل صاحبان داخل اسلام ہوئے۔

(۱) مسٹر ایل ہولٹ۔ اسلامی نام فتح دین رکھا گیا۔

(۲) مسٹر اینڈریو جیکب۔ اسلامی نام محمد یعقوب رکھا گیا۔

شکاگو میں تلاش مکان میں بہت تکلیف ہوئی۔ اشاعت اسلام کے کام کے سبب کئی دفعہ مکان تبدیل کرنا پڑا۔ ایک مکان میں سے صرف اس واسطے نکلنا پڑا۔ کہ مذکورہ بالا ہر دو نو مسلموں کا وہاں آنا مالکہ مکان کو ناگوار خاطر تھا۔ اور اُسنے نوٹس دیدیا۔ آخر ایک مکان کا حصہ ایک سال کے تحریری معاہدہ پر لیا گیا ہے۔ جس کا کرایہ بمعہ خرچ روشنی وغیرہ ایک سو ڈالر ماہوار ہے اور اسباب کے واسطے قریب آٹھ سو ڈالر کا خرچ درپیش ہے اس مکان میں لیکچروں کا انتظام بھی اب کیا گیا ہے۔ پہلا لیکچر گذشتہ ایتوار کو اتحاد اسلامی کے مضمون پر ہوا۔ اگلے ایتوار کو انشاء اللہ تعالیٰ اخوت اسلامی کی عالمگیر رُوح پر ہوگا۔

اہل امریکہ ان دنوں انتخاب پریزیڈنٹ میں بہت مصروف رہے۔

بڑے لیکچر مباحثات اور جھگڑے ہوئے بعض جگہ کشت و خون تک نوبت پہنچی۔ ہر ایک فریق کا لاکھوں روپیہ خرچ ہوا۔ آخر مسٹر ہارڈنگ اور اسکے طرفدار عہدیدار کثرت رائے سے منتخب ہوئے اس دفتر کو سب کو مبارکباد کے ساتھ دعوت اسلام دی گئی۔

خادم۔ محمد صادق عفا اللہ عنہ۔ ٦ر نومبر ١٩٢٠ء

4334 Ellis Avenue,
Chicago, Ill.
U. S. Amrica.

نامۂ لنڈن

(نوشتۂ مولوی عبدالرحیم صاحب نیر۔ ١٨ر نومبر ١٩٢٠ء)

تقریروں کے ذریعہ تبلیغ

اللہ تعالیٰ کی تائید سے تبلیغ حق کا کام تقریروں کے ذریعہ نہایت عمدگی سے ہو رہا ہے۔ ہفتہ میں تین مرتبہ کھلی ہوا کے اجلاس کئے جاتے ہیں۔ اور سینکڑوں مرد و عورت اسلام کے پیغام کو توجہ سے سنتے ہیں۔ ایک پادری صاحب جو عام عیسائیوں کی طرح متعصب نہیں ہیں ملاقات ہوئی اور وہ کہنے لگے "یہ ایک تقریر سنی ہے اور میں خوش ہوں کہ آپ لوگ بھی اپنا قیام محسوس کر رہے ہیں۔" جزائر غرب الہند امریکہ کے ایک انجنیئر سے گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ بولے "وفات مسیح کے متعلق آپکے خیالات قابل تسلیم اور معقول و درست ہیں۔" میں نے ایک پادری صاحب سے اس پر بحث کی اور حضرت احمد کی بعثت کا وعظ جو آپ کرتے ہیں۔ اُسے سنایا۔

ایک اور صاحب کہنے لگے "آپ لوگ بڑا مرکز لنڈن میں قائم کریں اور خوب اشاعت کریں۔"

نارتھ ہمپٹن میں لیکچر

مذکورہ بالا سلسلۂ تقاریر کے علاوہ مختلف سوسائٹیوں میں بھی تقریریں ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ مولوی فتح محمد سیال کا ایک لیکچر ٩ نومبر کو لنڈن کے مضافات نارتھ ہمپٹن میتھ میں ہندو انگلستان پر انگریز عورتوں کی ایک انجمن میں ہوا جس میں قریب سو کے قریب اور کچھ مرد تھے۔ لیکچر میں ان لوگوں کو بتلایا گیا کہ سیاسی اور روحانی رنگ میں ہندو انگلستان ایک دوسرے سے برابر کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں [illegible] اسلئے ان دو ملکوں کا ایک سلطنت کے سلک میں منسلک ہونا مفید ہے [illegible] الیشیا کے لوگوں کو صنعت و

حرفت کی تعلیم کی ضرورت ہے اور اسکے علاوہ ان لوگوں کی ضرورت ہے کہ انگلستان کے فنون زراعت طب انجنیرنگ وغیرہ سیکھیں اور اپنے ملکوں کو مادی رنگ میں ترقی دیں۔ اسی طرح انگلستان کو ضرورت ہے کہ مذہب سیکھے۔ کیونکہ مذہب انگلستان میں ہی نہیں۔ بلکہ تمام مغرب سے مفقود ہوگیا ہے۔ تم لوگ یا تو بت پرست اور اس سے بدتر تو اوہام پرست ہو۔ اور یا دہریہ۔ حقیقی مذہب جو تمام قوموں کی جان ہے۔ تم لوگ کھو بیٹھے ہو۔ تم لوگوں کے نزدیک مذہب ایک قصہ کہانی ہے۔ اور ہم لوگوں کے نزدیک حقیقت

اسلام میں حریت اور مساوات

الفضل کا یہ نمبر (٣٦) معمول سے کچھ زیادہ چھپایا گیا ہے تا ہمارے احباب حضرت خلیفۃ المسیح کے مضمون حریت و اسلام کی متعدد کاپیاں منگوا کر غیر احمدی حلقے میں تقسیم کر سکیں۔ ایک آنہ فی پرچہ قیمت کے حساب منگوا لیں۔

یہ خواجہ عباد اللہ صاحب اختر بی اے کے اس مضمون کا جواب ہے۔ جس کی نسبت ایڈیٹر صاحب وکیل نے اپنی مستدعویہ لقاہت و متانت کو چھوڑ کر نہایت سخیف الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ ایک جماعت کے لیڈر کے خیالات کی دھجیاں اڑا دی گئی ہیں۔ ناظرین کرام دیکھیں گے کہ قرآن دانی اور دین اسلام کا حقیقی فہم کس کو دیا گیا ہے۔

اب ایڈیٹر صاحب وکیل کو چاہیئے کہ خواجہ صاحب کے علاوہ تمام علماء پنجاب و ہند کی مدد حاصل کریں۔ اور اس پر اپنی تنقید شایع کر کے ہمیں دکھائیں کہ وہ از روئے شریعت اسلام حریت و مساوات کے معنے بہتر سمجھتے ہیں۔ ہمیں اُمید نہیں کہ وکیل کا ایڈیٹوریل سٹاف اس قسم کی جسارت کرے۔ کیونکہ وہ اس سے پہلے مسٹر ولوبی کے قتل کے معاملہ میں حضرت خلیفۃ المسیح کے ایک ادنیٰ غلام کے مقابل میں وہ زک کھا چکا ہے کہ تا عمر یاد رکھیگا۔ بشر طیکہ پنجابی کی ایک مشہور مثل پر عمل نہ ہو۔ ہم یہ الفاظ نہایت مجبوری سے لکھ رہے ہیں کیونکہ وکیل نے ایسا اعلان (دربارہ مضمون خواجہ اختر) بیہودہ الفاظ میں شایع کر کے جماعت احمدیہ کی تعلیم یافتہ جماعت کو نہایت دکھ دیا تھا۔ (ایڈیٹر الفضل)

"اسلام اور ایک آریہ پروفیسر کے حملہ کا جواب" یہ مضمون الگ بھی چھپوایا گیا ہے اور دفتر تالیف و اشاعت سے منگوایا جا سکتا ہے۔ قیمت [illegible] علاوہ محصول ڈاک [illegible] احباب جلد منگوائیں [illegible]

واقعات ہے ظاہر پر تم مسیح کی باتیں انجیلوں میں پڑھتے ہو۔ اور میں نے خود مسیح ناصری جیسا آدمی اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ اس سے بہتر اسلئے اب نجات اسی بات میں ہے کہ ہندسے مذہب اسلام و حقیقت روحانیت سیکھو۔ یہ سب آپ لوگوں کے بھلے کے لئے ہے تاکہ دین و دنیا میں فلاح پاؤ۔

لیکچر کے بعد اسلامی سیاست، تمدن اور اسلامی [illegible] کے متعلق [illegible] تعلیم [illegible] مولوی مبارک علی صاحب [illegible] محمد تبلیغ و

عزیز ظفر الحق چودہری صاحب مکرم کے ساتھ لیکچر سننے گئے تھے۔

مسٹر جان گارڈن کا لیکچر

احمدیہ لیکچر روم واقع دارالتبلیغ احمدیہ میں بماہ ہفتہ وار لیکچر ہوتے ہیں۔ گذشتہ اتوار کو مسٹر جان گورڈن نام ایک دوست کی تقریر تھی یہ صاحب زیر تبلیغ ہیں آدمی سنجیدہ و تعلیم یافتہ ہیں۔ تمام جلسوں میں آتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ کسی وقت اعلان اسلام بھی کر دینگے۔ ان کی تقریر نہایت عمدہ اور محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدح سے مملو تھی۔ قابل مقرر نے کہا کہ:۔

"میں سپرچوالیزم سے واقفیت رکھتا ہوں۔ اور ارواح کے ذریعہ سے جو پیغام ملے ہیں۔ وہ حضرت مسیح کا وہی اصل درجہ ظاہر کرتے ہیں۔ جو قرآن پاک نے بیان کیا ہے اور سپرچوالیزم کے ایک ماہر نے خود مسیح سے تعلق پیدا کیا ہے۔ اور اسلامی عقائد کی تصدیق کرتا ہے۔"

حضرت مسیح اور محمد رسول اللہ کی تعلیم کا مقابلہ کرتے ہوئے مقرر نے کہا:۔

"مسیح نے بڑا معجزہ پانی کو شراب بنا کر دکھایا۔ مگر محمد رسول اللہ نے شراب کو پانی بنا دیا اور صحرا کو باغ کر دیا۔"

"Jesus turned water into wine but Mahammad changed wine into water and made desert a garden."

اخبار ڈیلی گرافک

لنڈن کے مشہور روزانہ اخبار ڈیلی گرافک میں ہماری کھلی ہوا کے اجلاس کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ "عیسائی منبر کے نزدیک اور ایک لمبا آدمی مشرقی لباس اور پگڑی میں محمدیت کا وعظ پورے جوش کے ساتھ کر رہا تھا اور کہتا تھا کہ یورپ کا آیندہ مذہب اسلام ہو گا۔ میں نے اسکے منبر کے سامنے کی طرف لکھی ہوئی عبارت کا مطالعہ کیا اور معلوم کیا کہ وہ احمد کا خادم ہے۔ اور احمد جیسا کہ مقرر نے بتایا۔ اللہ کا نبی تھا۔ جو بنی نوع انسان کی ضرورت خاص کے وقت مشرق میں مبعوث ہوا۔ احمد کا ١٩٠٨ء میں انتقال ہوا۔"

حلقہ [illegible] احباب [illegible] آپ صاحبان جن کی قیمت الفضل ماہ دسمبر میں ختم ہوتی ہے وہ ضرور دستی دفتر الفضل میں پہنچا دیں جو ایام جلسہ میں صبح نماز فجر کے بعد سے ١١ بجے تک اور ٢ بجے شام سے رات گئے [illegible]

الفضل قادیان دار الامان ۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۲۰ء

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

هو الناصر

اسلام اور حُریّت و مساوات

(از حضرت خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ تعالیٰ)

کچھ دن ہوئے کہ ایک گریجوایٹ صاحب نے مری سے میرے نام کچھ سوالات لکھ کر بھیجے تھے جن کا جواب میں نے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مولوی فاضل و منشی فاضل قادیان کو جو ان دنوں صیغہ ڈاک کے انچارج ہیں لکھوایا تھا۔ یہ جواب گیارہ نومبر کے الفضل میں شایع کرا دیا گیا تھا۔ کیونکہ خط بھیجنے والے صاحب جبوقت جواب شایع کیا گیا ہے۔ مری میں نہ تھے۔ اور ان کا اسوقت کا پتہ معلوم نہ تھا۔ اور یہ بھی غرض تھی کہ دوسرے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھالیں۔ اس مضمون کے شایع ہونے پر امرتسر کے روزانہ اخبار وکیل میں خواجہ عباد اللہ صاحب اختر نے ایک سلسلہ مضامین شایع کرایا ہے۔ جس میں بعض ان باتوں کو رد کیا گیا ہے جو ان کے خیال میں میں نے لکھی تھیں۔ چونکہ حریت و مساوات کا سوال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور لوگوں کی طبایع اس کی طرف مائل ہیں۔ اسلئے میں چاہتا ہوں کہ خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی اے کے مضمون کے متعلق کچھ تحریر کروں تاکہ وہ ان لوگوں کے لئے جو حق طلبی کی عادت رکھتے ہیں رہنمائی کا کام دے۔ اور میرے نقطۂ نگاہ سے بھی لوگ آگاہ ہو جائیں۔

اصل مضمون پر غور کئے بغیر جواب دیا گیا۔

مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ خواجہ صاحب موصوف نے میرے خط پر غور کئے بغیر اس کا جواب دینا شروع کر دیا ہے اگر وہ اسے غور سے پڑھتے۔ تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اسمیں حریت و مساوات کو اسلامی تعلیم کے خلاف نہیں کہا گیا۔ بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ الفاظ مبہم ہیں ان کی مختلف تشریحات ہو سکتی ہیں۔ جنمیں سے بعض تشریحات کے موجب ان کا مفہوم اسلامی احکام میں شامل ہو گا۔ اور بعض کے مطابق اسلامی احکام کے رُو سے جائز ہو گا اور بعض کے رو سے منع ہو گا۔ اور پھر انکو یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ اس مضمون میں میں نے اصول کے لفظ کو خاص معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اور وہ وہی معنے ہیں کہ جو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات اور ائمہ اسلام کے استعمال سے ثابت ہوتے ہیں۔

سائل سے حریت و مساوات کی تشریح چاہی گئی تھی

چونکہ خواجہ صاحب نے میرے مضمون پر غور نہیں کیا۔ اسلئے ایک تو انھوں نے یہ دھوکا کھایا ہے کہ گویا میں ہر ایک صورت میں حُریت اور مساوات کو ناجائز سمجھتا ہوں یا ان کا قائم کرنا ناجائز سمجھتا ہوں حالانکہ میرے خط کا جو حصہ انہوں نے خود نقل کیا ہے۔ اسی سے [illegible] ثابت ہو سکتا تھا کہ یہ وہم ان کا غلط ہے وہ میرے خط کا یہ حصہ اپنے مضمون میں نقل کرتے ہیں:۔ "حُریت و مساوات اسلام کے بنیادی اُصول میں سے نہیں ہیں۔ خود یہ الفاظ ایسے مبہم ہیں کہ اپنی بعض تعریفوں کے لحاظ سے اچھے اخلاق بھی نہیں کہلا سکتے۔ اس لئے حریت اور مساوات کی جب تک تعریف نہ کی جائے۔ اسوقت تک نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام انہیں جائز بھی قرار دیتا ہے یا نہیں مجھے نہیں معلوم کہ آپکے ذہن میں ان کی کیا تعریف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی تعریف کے ماتحت ان دونوں امور (حریت و مساوات) کا خیال رکھنا ایک مسلم کے لئے ضروری ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ ایک دوسری تعریف کے مطابق صرف جائز ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ ایک تیسری تعریف کے مطابق ناجائز ہو۔" میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس عبارت کی موجودگی میں

جسے انھوں نے خود نقل کیا ہے۔ وہ یہ نتیجہ کس طرح نکال سکتے تھے کہ میں نے حریت و مساوات کو اسلامی احکام میں شامل نہیں کیا۔ ان الفاظ سے تو صاف ثابت ہے کہ میں سائل کو قائل کرنے کے لئے اور اسکی غلطی پر اسے آگاہ کرنے کے لئے پہلے اس سے حریت و مساوات کی تشریح کرانی چاہتا ہوں تاکہ جب وہ خود تشریح کر دے۔ تو اس کی تصدیق کرنی یا اس کی غلطی نکالنی آسان ہو جائے۔ اور میں نے خود لکھ دیا ہے کہ ان الفاظ کی کئی تشریحیں ہو سکتی ہیں۔ بعض کے لحاظ سے ان الفاظ کا مفہوم اسلامی اوامر میں شامل ہو جائیگا۔ بعض کے لحاظ سے صرف جائز رہے گا۔ اور بعض کے لحاظ سے منع ہو جائیگا۔ اگر وہ میرے مضمون پر غور کرتے تو بجائے اس کا جواب لکھنے کے پہلے حریت اور مساوات کی تشریح کرتے۔ پھر مجھ سے دریافت کرتے کہ یہ تشریح ان الفاظ اسلامی احکام میں شامل ہے یا اسلام کے رُو سے جائز ہے۔ یا منع ہے اور پھر میرے جواب پر جو چاہتے لکھتے۔ میں تو سائل سے ان الفاظ کی تشریح چاہتا ہوں۔ اور خواجہ صاحب پہلے جواب لکھنا شروع کر دیتے ہیں کاش! وہ جواب لکھنے کی طرف توجہ کرنے سے پہلے میرے خط کو سمجھنے کی تکلیف گوارا کرتے۔

اُصول کا لفظ ارکان اسلام کے معنوں میں استعمال کیا گیا

دوسری ٹھوکر جلد بازی کے سبب سے خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر نے یہ کھائی ہے کہ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ میں نے اُصول اسلام کے الفاظ کن معنوں میں استعمال کئے ہیں۔ جیسا کہ میری تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ الفاظ میں نے ارکان اسلام کے معنوں میں استعمال کئے۔ لیکن خواجہ صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ انہیں احکام کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ احکام تو اسلام کے سینکڑوں ہیں۔ مگر صرف چند ہی ارکان کا پتہ قرآن کریم اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ جن عقائد کو خدا تعالےٰ نے ایمان میں شامل کیا ہے۔ اور ان کا انکار کفر قرار دیا ہے وہ ارکان ایمان ہیں۔ اور قرآن کریم سے ایسی باتیں پانچ ہی ثابت ہوتی ہیں۔ اول اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔ دوم ملائکہ پر۔ سوم نبیوں پر۔ چہارم کتب سماوی پر۔ پنجم۔ بعث بعد الموت پر۔ چونکہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کے اندر ہی اس کی صفات کے ظہور پر ایمان لانا بھی شامل ہے۔ اسلئے مسلمانوں نے ایمان بالقدر کو بھی ارکان ایمان میں شامل کیا ہے۔ اور یہ ان کا فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق ہے۔

قرآن کریم سے ارکان اسلام کا ثبوت

قرآن کریم سے ارکان اسلام مختلف آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ جنہیں سے ایک یہ آیت ہے۔ ومن یکفر باللّٰہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاٰخر فقد ضل ضلالا بعیدا یعنی جو شخص کفر کرتا ہے اللہ تعالےٰ کا اور ملائکہ کا اور اس کی کتب کا اور اس کے رسولوں کا اور یوم آخر کا وہ دور کی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ ان الذین یکفرون باللّٰہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللّٰہ ورسلہ ویقولون نومن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا اولٰئک ھم الکافرون حقا واعتدنا للکافرین عذابا مھینا۔ یعنی وہ لوگ جو کفر کرتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولوں کا۔ اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کریں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانینگے۔ بعض کو نہیں مانینگے۔ اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راستہ تلاش کریں۔ یہ لوگ پکے کافر ہیں۔ اور کافروں کے لئے ہم نے رسوا کرنیوالا عذاب مقرر کیا ہے۔ پس قرآن کریم کے رو سے عقائد کے اصول جنہیں سے کسی ایک کے چھوٹنے پر بھی انسان کافر ہو جاتا ہے۔ یہی پانچ ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ملائکہ پر ایمان لانا کتب پر ایمان لانا رسولوں پر ایمان لانا اور یوم الآخر پر ایمان لانا قضا و قدر پر ایمان جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ خدا تعالیٰ پر ایمان لانے میں شامل ہے۔ کیونکہ بندہ کا خدا تعالیٰ سے تعلق اس کی قدر کے ہی ذریعہ ہے۔ اگر قضا و قدر جاری نہ ہو۔ تو خدا تعالےٰ اور بندہ کے درمیان کوئی واسطہ ہی نہیں رہتا۔ اور ایسا ایمان لانے میں کوئی فائدہ یا روحانی ترقی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایمان بالقدر کو بھی ایمانیات کے اندر شامل کیا ہے۔ احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے یہی ارکان ہیں۔ کیونکہ احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ حضرت جبرئیل آئے۔ اور آپ سے سوال کیا کہ "ما الایمان" ایمان کیا ہے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ الایمان ان تومن باللّٰہ وملائکتہ وبلقائہ ورسلہ وتومن بالبعث۔ یعنی ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اسکے فرشتوں پر اور اس کے لقاء پر اور اس کے رسُولوں پر۔ اور یہ کہ تو ایمان لائے مرنے کے بعد اٹھنے پر اور اسمعیل کی روایت میں برسلہ کے بعد کتبہ بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ کی کتب پر ایمان لائے۔ مگر میرے نزدیک اس لفظ کے بغیر بھی کتابوں پر ایمان کا ذکر اس حدیث میں آجاتا ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں لقاء کا لفظ ہے۔ جس کے معنے شراح نے خدا تعالیٰ کی ملاقات کے کئے ہیں۔ اور یہ معنے ہیں بھی ٹھیک۔ مگر انہوں نے اس سے مُراد مرنے کے بعد کی ملاقات لی ہے۔ حالانکہ یہ بات بعث پر ایمان لانے کے اندر آگئی ہے۔ لقاء سے مراد کتب ہی ہیں۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کی ملاقات کا ذریعہ ہیں۔ بندہ اپنے رب سے اسکے کلام کے ذریعہ سے ہی ملتا ہے۔ اس کے متعلق ایک لطیف استدلال صاحب بصیرت کے لئے جو دوسروں کی خوشہ چینی پر کفایت نہ کرتا ہو۔ آیۃ کریمہ ولقد اٰتینا موسی الکتٰب فلا تکن فی مریۃ من لقائہ سے بھی ہو سکتا ہے۔

وہ اعمال جن کا اسلام نے حکم دیا ہے۔

دوسری قسم ہے اعمال کی انہیں سے ایک تو فعلیہ ہیں۔ یعنی جن کے کرنے کا حکم ہے۔ اور ایک ترکیہ ہیں یعنی جن کے ترک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ فعلیہ اصول میں نے اپنے خط میں نماز زکوٰۃ حج اور روزہ بتلائے تھے اور یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ارشاد ہے۔ اس میں میرا کوئی دخل نہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ بنی الاسلام علیٰ خمس شہادۃ ان لا الٰہ الا اللّٰہ وان محمدًا رسول اللّٰہ۔ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والحج وصوم رمضان۔ بخاری کتاب الایمان۔ یعنی اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ گواہی دینا کہ اللہ ایک ہے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسکے رسول ہیں۔ اور نماز ادا کرنی اور زکوٰۃ دینی اور حج اور رمضان کے روزے۔ اسی حدیث میں جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کے سوال پر کہ اسلام کیا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ الاسلام ان تعبد اللّٰہ ولا تشرک بہ وتقیم الصلوٰۃ وتودی الزکوٰۃ المفروضۃ وتصوم رمضان۔ یعنی اسلام یہ ہے کہ تو خدا تعالیٰ کی عبادت کرے۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک کرے اور نماز کو قائم کرے

اور فرض زکوٰۃ ادا کرے - اور رمضان کے روزے رکھو - بخاری میں حج کا ذکر نہیں ہے - لیکن دوسرے بعض راویوں نے حج کا بھی ذکر کیا ہے -

اسی طرح طلحہ بن عبید اللہ سے روایت ہے - کہ ایک شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے سوال کیا کہ اسلام کیا ہے - آپ نے فرمایا کہ خمس صلوٰۃ فی الیوم واللیلۃ فقال ھل علی غیرھا قال لا الا ان تطوع قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصیام رمضان قال ھل علی غیرہ - قال لا الا ان تطوع قال وذکر لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الزکوٰۃ - قال ھل علی غیرھا قال لا الا ان تطوع قال فادبر الرجل وھو یقول واللہ لا ازید علی ھذا ولا انقص قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افلح ان صدق - یعنی اسلام کے اصول پانچ نمازیں ہیں - دن اور رات میں اس نے پوچھا کہ کیا انکے سوا مجھ پر کچھ اور بھی فرض ہے - آپ نے فرمایا نہیں - ہاں اگر شوق سے زیادہ نماز پڑھو تو اور بات ہے - پھر آپ نے فرمایا اور رمضان کے روزے اس پر اس نے دریافت کیا کہ ان کے سوا مجھ پر اور روزہ بھی ہیں - آپ نے فرمایا کہ نہیں - ہاں تم اپنی خواہش سے زیادہ رکھو تو رکھ سکتے ہو - پھر آپ نے اس کے سامنے زکوٰۃ کا مسئلہ بیان فرمایا - اس نے پوچھا کہ کیا مجھ پر اس سے زیادہ کچھ اور بھی فرض ہے - آپ نے فرمایا کہ نہیں - ہاں اگر تم اپنی خواہش سے زیادہ دو تو یہ اور بات ہے - اس پر وہ شخص واپس چلا گیا - اور چلتے ہوئے کہتا گیا کہ خدا کی قسم میں نہ اس سے زیادہ کروں گا نہ کم - رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اس شخص نے اپنی بات پوری کر دی - تو کامیاب ہو گیا - اس حدیث میں حج کا ذکر نہیں - لیکن چونکہ دوسری احادیث میں ارکان اعمال میں حج کو شامل کیا گیا ہے - اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال فرما کر عرب لوگ حج کو خود ہی ضروری خیال کرتے ہیں - صرف وہ احکام بیان فرمائے جو اسلام میں نئے نازل ہوئے تھے -

غرض عبادت فعلیہ کے یہ چار ارکان ہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں اور شراح احادیث اس شخص کے سوال کے متعلق کہ اسلام کیا ہے - لکھتے ہیں کہ اس کا سوال ان ارکان اسلام کے متعلق تھا جو اعمال سے تعلق رکھتے ہیں - پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور علماء اسلام کی تشریح کے مطابق اعمال فعلیہ کے یہی چار ارکان ہیں - اور یہی چاروں میں نے اپنے جواب میں بیان کئے ہیں -

عبادت ترکیہ کے اصولی احکام

عبادت ترکیہ یعنی ان احکام میں سے جنکے نہ کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے - میں نے چار اصل بیان کئے ہیں - قتل نہ کرنا - چوری نہ کرنا زنا نہ کرنا - خیانت نہ کرنا یہ چار اصل بطور استدلال میں نے قرآن کریم ہی سے لئے ہیں - کیونکہ قرآن کریم میں قتل کے جرم کی سزا قتل بیان کی گئی ہے - اور زنا کی سزا کوڑے - اور بعض صورتوں میں مطابق فیصلہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم رجم - اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا - اور ڈاکہ چوری کی حد میں آجاتا ہے یا قتل کے دائرہ میں - اسلئے اسکو میں نے الگ نہیں بیان کیا تھا - چوتھا جرم جس کیلئے سزا مقرر ہے - قذف اور افترا ہے جسے میں نے وسعت کے خیال سے خیانت سے تعبیر کیا تھا - پس یہی چار احکام ہیں جو عبادت ترکیہ کے اصل ہیں - باقی جسقدر احکام ہیں - ان کی سزا یا تو غیر معین ہے - اور ریاست پر چھوڑ دی گئی ہے یا ان کا

معاملہ قیامت پر رکھا گیا ہے - ان کے سوا باقی تمام عقائد یا اوامر یا نواہی انہی کے فروع ہیں یا انکے اندر وہی اصل مخفی ہے - جو ان عقائد و اوامر و نواہی میں ہے - یہ چاروں نواہی یکجائی طور پر عورتوں کی بیعت کے الفاظ میں جمع کر دئے گئے ہیں - چنانچہ سورہ ممتحنہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے - یا ایھا النبی اذا جاءک المؤمنات یبایعنک علیٰ ان لا یشرکن باللہ شیئا ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولا یاتین ببھتان یفترینہ بین ایدیھن وارجلھن ولا یعصینک فی معروف فبایعھن واستغفر لھن -

اصول اور احکام میں فرق نہیں کیا گیا -

کوئی عقلمند یہ خیال نہیں کر سکتا کہ میرا یہ مطلب تھا کہ ان احکام کے سوا اسلام میں اور کوئی حکم ہی نہیں ہیں - بلکہ میرا مطلب جیسا کہ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے - یہی تھا - کہ اصول اسلام یہی ہیں - گو ان کے سوا احکام سینکڑوں ہیں - چنانچہ سائل کے اس سوال کے جواب میں کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کا یہ فرض نہیں کہ وہ دنیا کی چھوٹی حکومتوں کو ظلم سے بچائیں - میں نے یہی جواب دیا ہے - کہ اگر حریت و مساوات کی کوئی ایسی تعریف ہے جو احکام اسلام کے نیچے آجاتی ہے اور کسی اور اسلامی حکم کے مخالف نہیں پڑتی - تو اس کی تلقین کرنا خلفاء اسلام کا فرض ہے - اس جواب سے صاف ظاہر ہے - کہ میں نے اصول اور احکام میں فرق کیا ہے کیونکہ ایک طرف تو میں نے حریت و مساوات کو اصول اسلام سے خارج کیا ہے - اور دوسری طرف یہ لکھا ہے کہ اگر اس کی کوئی ایسی تعریف کی جائے - جو احکام اسلام کے مطابق ہو - تو پھر اس کی تلقین فرض ہو جائیگی - خواجہ صاحب نے اسی فرق کو نہ سمجھتے ہوئے میرے مضمون کا جواب لکھنا شروع کر دیا ہے - اور حریت و مساوات کو احکام اسلام میں سے ثابت کرنے کی کوشش کر کے یہ فرض کر لیا ہے - کہ انہوں نے میرے مضمون کا جواب دے دیا ہے - حالانکہ نہ میں نے یہ لکھا تھا کہ حریت و مساوات کی تمام تعریفات کے رو سے وہ احکام اسلام میں شامل نہیں ہو سکتیں - اور نہ میں نے یہ لکھا تھا - کہ اصل اور حکم ایک ہی شے ہے - کاش وہ ذرہ بھر بھی تدبر سے کام لیتے اور میرے مضمون پر غور کرتے اور یا تو سائل کو خود آگے آکر اپنے مطلب کو بیان کرنے دیتے - یا خود حریت و مساوات کی تعریف کر کے اسکے متعلق مجھ سے سوال کرتے کہ یہ تعریف احکام اسلام میں شامل ہے یا نہیں - اگر اس تعریف کو میں احکام اسلام میں شامل نہ قرار دیتا - اور اگر ان کی تسلی میرے جواب سے نہ ہوتی - تو وہ اس کا جواب لکھتے -

خواجہ صاحب کے نزدیک حریت و مساوات کو کیوں اصول اسلام سے خارج کیا گیا

خواجہ صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں یہ بات ظاہر کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ مجھے دھوکا کس طرح لگ گیا - اور کس طرح میں نے حریت و مساوات کو اسلام کے بنیادی اصول میں سے خارج کر دیا - اور بعض آیات ایسی نقل کی ہیں جنمیں بعض گروہوں کے غیر مساوی ہونے کا ذکر ہے - اور نتیجہ نکالتے ہیں کہ شاید ان آیتوں سے مجھے دھوکا لگ گیا - جہاں تک میں سمجھتا ہوں - خواجہ صاحب کا منشاء یہ نہیں ہے کہ وہ میرے مضمون کو کسی قدر معقولیت کا جامہ پہنا دیں - بلکہ ان کا اصل منشاء یہ بات ظاہر کرنا ہے کہ وہ ان دلائل سے کبھی خوب واقف ہیں - جو میں اپنے مدعا کے ثبوت کے لئے پیش کروں گا - حالانکہ ان کو معلوم ہونا چاہئے تھا کہ اس معاملہ میں دلائل دینا میرے

ذمہ نہیں۔ بلکہ سائل کے ذمہ ہے کہ وہ پہلے اپنے سوال کا مطلب بیان کرے۔ جب تک وہ اپنے مطلب کو واضح نہ کرے۔ اسوقت تک اسکے سوال کا جواب دینا وقت کو ضائع کرنا ہے۔ بلکہ اگر وہ سوال کو واضح کریگا۔ تو اس کے سوال کا جواب خود اس کی اپنی تشریح میں ہی آجاویگا یا اسپر اپنی غلطی کھل جاویگی ؂

الزامی جواب کی اقسام

اس تمہید کے بعد میں خواجہ صاحب کے مضمون کے مختلف حصوں پر روشنی ڈالتا ہوں۔ خواجہ صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ

یہ تنے سائل کو الزامی جواب دئے ہیں۔ اور یہ کمزوری ہے۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ الزامی جواب سے بالعموم اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ صرف سائل خاموش ہو جاتا ہے۔ اور اسی لئے الزامی جواب کو اصولی جواب کے مقابل قرار دیکر اسے کمزور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ کلام کی حقیقت اور اس کے معارف سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ الزامی جواب کئی اقسام کے ہوتے ہیں بعض دلیل کے لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں بعض مضبوط ہوتے ہیں اور بعض ایسے مضبوط ہوتے ہیں کہ اصولی جواب بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا ؂

کونسا الزامی جواب کمزور ہوتا ہے

وہ الزامی جواب جو کمزور ہوتا ہے۔ اس کی یہ شرط ہے کہ اس کے ذریعے کسی عیب کو چھپانے کی کوشش کی جائے۔ یعنی جسپر اعتراض کیا جائے وہ اسبات کو محسوس کرتا ہو کہ اس کی جس بات پر اعتراض کیا گیا ہے وہ واقعہ میں ایک عیب اور کمزوری ہے۔ اور اسپر پردہ ڈالنے کے لئے معترض کے کسی عیب کی طرف اشارہ کردے۔ مثلاً دو شخص جو ملکر تجارت کر رہے ہوں۔ انمیں سے ایک دوسرے کو خیانت کرتے ہوئے دیکھے۔ اور اسے کہے کیوں صاحب یہ کام بھی جائز ہے۔ تو آگے سے وہ شخص معترض کی کسی خیانت کی طرف جس سے وہ آگاہ تھا۔ اشارہ کرکے کہدے کہ ہاں جس طرح وہ جائز تھی یہ بھی جائز ہے۔ یہ الزامی جواب کہلائیگا۔ اور کمزور ہوگا۔ کیونکہ اس جواب سے جواب دینے والے کی بریت ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف اسقدر ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص جس نے اعتراض کیا تھا خود اسی قسم کی مرض میں مبتلا ہے۔ اور اس جواب سے مجیب کی غرض صرف معترض کو خاموش کرنا ہے ؂

قسم دوم کے الزامی جواب

دوسری قسم کا الزامی جواب یہ ہوتا ہے۔ کہ جس بات پر اعتراض کیا جاتا ہے وہ مجیب کے مذہب میں پائی ہی نہیں جاتی یا اسکے نزدیک جائز ہی نہیں ہوتی۔ یا یہ کہ وہ بات عقلاً اور اخلاقاً بالکل درست ہوتی ہے۔ اور اسپر اعتراض ہی نہیں پڑ سکتا۔ یا یہ کہ جو اعتراض کیا جاتا ہے۔ وہ اعتراض ہی نہیں ہوتا۔ لیکن مجیب وقت بچانے کیلئے کسی ایسی ملتی جلتی لیکن نادرست اور ناواجب بات کی طرف جو معترض یا معترض کے مذہب یا عقیدہ میں پائی جاتی ہے۔ اشارہ کر دیتا ہے۔ اور اس سے اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ سائل کو خاموش کردے۔ مثلاً اگر کوئی آریہ اسلام پر اعتراض کردے کہ اسلام میں متعہ کی اجازت ہے اور اسپر کوئی سنی المذہب اسکے جواب میں کہدے کہ ہاں یہ مسئلہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آریہ مت میں نیوگ کا مسئلہ۔ تو اس سے اس کی غرض معترض کو خاموش کرنا ہوگی۔ اور وہ صرف اس تاریخی بحث میں پڑنے سے بچنے کی کوشش کریگا کہ متعہ اسلامی مسئلہ ہے بھی کہ نہیں۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے۔ کہ اسلام میں نہ اسوقت متعہ جائز ہے نہ کبھی پہلے جائز ہوا۔ جب تک اسلام کا حکم اس مسئلہ کے متعلق نازل نہ ہوا تھا۔ اسوقت تک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم عرب کی رسوم کے مطابق اس فعل کی اجازت دیتے رہتے تھے۔ کیونکہ آپ کی عادت مبارک میں یہ بات داخل تھی۔ کہ آپ الٰہی حکم کے نزول تک لوگوں کی رسوم و عادات میں دخل دینا پسند نہ فرماتے تھے۔ اور الٰہی کلام کا ادب رکھتے تھے۔

یا مثلاً کوئی آریہ صاحب اسلام کے مسئلہ کثرت ازدواج پر اعتراض کردیں اور کوئی مسلمان نیوگ کا حوالہ دیکر ان کو خاموش کرادے۔ تو یہ بھی الزامی جواب ہوگا۔ لیکن اس میں پہلے جواب سے یہ فرق ہوگا۔ کہ پہلا جواب تو ایک ایسے اعتراض سے بچنے کے لئے تھا۔ جس کا مورد اسلام میں موجود ہی نہ تھا۔ اور یہ جواب ایک ایسی بات پر سے اعتراض ہٹانے کے لئے ہے۔ جو فی الواقعہ اسلام میں موجود ہے اور صرف وقت کو بچانے کے لئے یا معترض پر یہ بات روشن کردینے کیلئے ہے کہ اس کا اعتراض نیک نیتی پر مبنی نہیں۔ کیونکہ باوجود ایک ایسی بات پر یقین رکھنے کے جسمیں شناعت کا پہلو موجود ہے وہ ایک ایسی بات پر اعتراض کرتا ہے جسمیں کوئی شناعت کا پہلو موجود ہی نہیں۔

یا مثلاً یہ کہ کوئی مسیحی اسلام پر اعتراض کرے کہ اسلام کی ترقی کا باعث جنت کا عقیدہ ہے۔ لوگوں کو لالچ دلا کر اسلام میں داخل کر لیا گیا ہے۔ اور اس کا کوئی مسلمان یہ جواب دیدے کہ جس طرح ادنیٰ اقوام کو مسیحی روپیہ پیسہ دیکر اور قسم قسم کی لالچیں دیکر مسیحی بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی کیا ہے۔ یہ جواب بھی اسی قسم کے الزامی جوابوں میں شامل ہوگا۔ جو پہلے مذکور ہوئی ہے۔ مگر پہلے دو جوابوں میں اور اس جواب میں یہ فرق ہوگا کہ پہلا الزامی جواب تو ایک ایسے اعتراض کے متعلق تھا جس کا مورد اسلام میں موجود ہی نہ تھا۔ اور دوسرا الزامی جواب ایک ایسے اعتراض کے متعلق ہے۔ جس کا مورد تو موجود تھا۔ لیکن اسپر وہ اعتراض نہ پڑتا تھا۔ جو دشمن نے کیا۔ اور یہ آخری مثال اس امر کی ہے کہ جو اعتراض کیا گیا تھا وہ اعتراض ہی نہیں ہے۔ اس قسم کی تحریک کرنی کہ اس مذہب کو قبول کرکے تم سکھ پاؤگے۔ لالچ نہیں ہے بلکہ مذہب کی ضرورت کا اظہار ہے اور اس دعویٰ کے بغیر کوئی مذہب سچا ہو ہی نہیں سکتا۔

قرآن کریم سے دوسری قسم کے الزامی جواب کی مثال

یہ دوسری قسم الزامی جواب کی گو پہلی قسم کی نسبت مضبوط ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں یہ کمزوری ہے کہ اس سے دشمن کی کمزوری اور اس کا تعصب تو ظاہر ہو جاتا ہے۔ لیکن اس امر کی نسبت لوگوں کا علم وسیع نہیں ہوتا جسپر اعتراض کیا گیا تھا۔ کیونکہ لوگ دیکھتے ہیں کہ جس امر کی طرف اشارہ کرکے معترض کو خاموش کیا گیا ہے۔ وہ اور قسم کا ہے اور جسپر اعتراض کیا گیا ہے وہ اور قسم کا ہے۔ اور ان کے دل میں یہ تڑپ باقی رہتی ہے۔ کہ اس کی خوبیوں پر بھی اطلاع ملے۔ بلکہ معترض کے دل میں بھی یہی خواہش باقی رہتی ہے۔ گو وہ اس جواب کے ڈر سے دوبارہ اعتراض اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہ قسم جواب کی اسی وقت مکمل ہوتی ہے۔ جب اس کے ساتھ اصولی جواب بھی دیدیا جائے۔

چنانچہ قرآن کریم میں اس قسم کے الزامی جوابوں کی مثالیں ملتی ہیں جیسا کہ فرماتا ہے۔

الذین قالوا ان اللہ عہد الینا الا نؤمن لرسول حتی یاتینا بقربان تاکلہ النار قل قد جاءکم رسل من قبلی بالبینت وبالذی قلتم فلم قتلتموھم ان کنتم صادقین۔

یعنی وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہوا ہے کہ ہم صرف اس رسول کو مانیں جو سوختنی قربانی کا حکم دے۔ ان سے کہدو کہ مجھ سے پہلے بہت رسول تمہاری طرف آئے ہیں۔ جن کے پاس دلائل بھی تھے۔ اور وہ حکم بھی دیتے تھے جسکی طرف تم اشارہ کرتے ہو۔ پھر کیا اگر تم سچے ہو۔ تو تم نے ان کو مان لیا تھا۔ اور ان کا مقابلہ نہیں کیا تھا۔

اسجگہ یہ ثابت نہیں کیا گیا کہ سوختنی قربانی کا حکم ضروری ہے یا نہیں۔ صرف ان کو اس جواب سے خاموش کردیا گیا ہے کہ تمہارا حق نہیں کہ یہ اعتراض کرو۔ کیونکہ تم ان رسولوں کا مقابلہ بھی کرتے رہے ہو۔ جو سوختنی قربانی کا بھی حکم دیتے تھے۔ مگر چونکہ قرآن کریم ہر ایک پہلو کو مکمل کرتا ہے۔ اگلی آیات میں جاکر یہ بھی جواب دیدیا کہ یہ دعویٰ باطل ہے چنانچہ آگے چل کر فرمایا۔ واذاخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتاب لتبیننہ للناس ولا تکتمونہ فنبذوہ وراء ظھورھم۔ اللہ تعالیٰ نے تو اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ یہ مسائل تورات کو چھپائینگے نہیں لیکن یہ اس عہد کے پابند نہیں رہے۔ یعنی اب یہ لوگوں کو غلط مسائل بتانے لگے ہیں جنہیں سے ایک یہ مسئلہ بھی ہے۔ کہ اسوقت تک کسی رسول کو نہیں ماننا چاہیئے جب تک وہ سوختنی قربانی کا حکم نہ دے۔

قسم سوم کے الزامی جواب

ان دونوں قسموں کے سوا ایک تیسری قسم الزامی جواب کی ہوتی ہے جو بلحاظ دلیل کے ایسی ہی مضبوط ہوتی ہے جیسے کہ اصولی جواب۔ کیونکہ گو وہ بظاہر الزامی جواب نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی اصل غرض یہی ہوتی ہے کہ اصولی جواب کی طرف سائل کی توجہ کو پھیرا جائے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کبھی معترض کو سمجھانیکے لئے اسکے اعتراض کے جواب میں اسی کے عقیدہ اور خیال کی ایک ایسی بات اسکو یاد دلائی جاتی ہے۔ جو بعینہٖ اسی قسم کی ہوتی ہے۔ جس پر اس شخص نے اعتراض کیا ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح یہ بات قابل اعتراض نہیں ہوتی۔ جس پر اعتراض کیا گیا ہے۔ وہ بھی قابل اعتراض نہیں ہوتی۔

قرآن کریم سے تیسری قسم کے الزامی جواب کی مثال

اس قسم کے الزامی جواب قرآن کریم میں بھی دیئے گئے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کفار کا اعتراض سورہ انبیاء میں نقل فرماتا ہے کہ ھل ھذا الا بشر مثلکم نہیں ہے یہ شخص مگر تمہارے جیسا ایک آدمی۔ اور اس کا جواب آگے چل کر یہ دیتا ہے کہ وما ارسلنا قبلک الا رجالا نوحی الیھم فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ یعنی ہم نے تجھ سے پہلے بھی آدمی ہی بھیجے تھے۔ جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ اگر تم کو نہ معلوم ہو تو یہود و نصاریٰ سے پوچھ لو۔ اسمیں بھی الزامی جواب ہی دیا ہے۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مخالف اور کسی کی نہ سہی حضرت ابراہیم کی نبوت کے اور آپ کے خدا رسیدہ ہونے کے تو ضرور قائل تھے۔ اللہ تعالیٰ بجائے یہ ثابت کرنیکے کہ نبی کے لئے بشر ہونا ضروری ہے۔ صرف یہ حوالہ دیتا ہے کہ پہلے نبی جن کو مانتے ہو۔ وہ بھی تو ایسے ہی تھے۔

قسم سوم کے الزامی جواب کا فائدہ

اس قسم کے الزامی جواب سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ معترض جس بات کو تسلیم کرتا ہے۔ اسکے خلاف اسے تعصب نہیں ہوتا۔ اور اس کی تائید میں اسکے پاس دلائل ہوتے ہیں۔ پس بجائے اسکے کہ اس بات کی تائید میں جس پر اس نے اعتراض کیا ہوتا ہے۔ دلائل دیئے جاویں یہ زیادہ سہل طریق ہوتا ہے کہ اس کی تسلیم کردہ باتوں میں سے کوئی اس کے سامنے پیش کردی جائے تاکہ اس کی تائید میں جو دلائل اس کے پاس ہیں۔ انہی کے ذریعہ سے وہ اس بات کی صداقت کو بھی سمجھ لے جس پر وہ اعتراض کرتا ہے۔ پس گو بظاہر یہ جواب الزامی ہوتا ہے۔ لیکن دراصل حقیقی جواب ہوتا ہے۔ اس میں اور حقیقی جواب میں صرف یہ فرق ہوتا ہے کہ حقیقی جواب میں دلائل مجیب کو دینے پڑتے ہیں۔ اور اس قسم کے الزامی جواب میں خود معترض کے ہی منہ سے اپنے دعویٰ کی تائید میں دلائل دلوائے جاتے ہیں۔ ایسا الزامی جواب بجائے کمزور ہونے کے عام طور پر حقیقی کہلانیوالے جواب سے زیادہ سہل اور مفید ہوتا ہے۔ اور مضبوطی میں بھی اس سے کم نہیں ہوتا۔ اور خصوصاً اس صورت میں اور بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ جبکہ اعتراض صرف ایک ہی جماعت کی طرف سے وارد ہوتا ہو۔ کیونکہ جو اعتراض مختلف پہلو رکھتا ہو اور متعدد جماعتوں کی طرف سے پڑسکتا ہو۔ وہ حقیقی جواب کے بغیر مکمل طور پر حل نہیں ہوسکتا کیونکہ الزامی جواب صرف اس نقطۂ خیال پر روشنی ڈالیگا۔ جو سائل یا اسکے ہم خیالوں سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری جماعتوں کے نقطۂ خیال کے مطابق جو اس پر اعتراض ہوتا ہے وہ دور نہ ہوسکیگا۔ لیکن اگر اعتراض ایک ہی جماعت کی طرف سے ہوسکتا ہو۔ تو پھر مندرجہ بالا قسم کا الزامی جواب حقیقی جواب سے بھی زیادہ مفید ہوگا۔ کیونکہ اسمیں حقیقی جواب کی طرح روشنی بھی ہوگی۔ اور الزامی جواب کی طرح قوت اور شدت بھی ہوگی۔

سائل کو تیسری قسم کے جواب دیئے گئے تھے

اس تفصیل کے بعد میں خواجہ صاحب کو توجہ دلاتا ہوں کہ میرے جوابات گو الزامی تھے۔ مگر اسی تیسری قسم کے تھے۔ مثلاً جلیانوالہ کے باغ کے متعلق جو اعتراض ہوا ہے۔ اس کا جو جواب میں نے دیا ہے اور جس کی طرف خواجہ صاحب نے اشارہ بھی کیا ہے وہ اسی قسم کا ہے۔ کیونکہ اس میں نے سائل کے ہم خیال لوگوں کے ایک مستحسن فعل کی طرف اشارہ کرکے بتایا ہے۔ کہ جس طرح انہوں نے فساد کو دور کرنیکے لئے کمارپور اور بہار کے وحشی اور انسانیت سے عاری قاتلوں کو معاف کردیا ہے۔ اسی طرح اگر بادشاہ معظم کے اعلان کے جواب میں ہم لوگوں نے بھی جلیانوالہ کے واقعہ کو بھلا دیا ہے تو کونسی قباحت آگئی۔ یہاں دونوں فعل مستحسن ہیں۔ اور ایک ہی قسم کے ہیں۔ سائل ایک کام کرتا ہے۔ اور دوسرا اسے برا معلوم ہوتا ہے۔ اسکو یہ امر سمجھانے کے لئے کہ دوسرا کام بھی مستحسن ہے۔ اسکے اپنے فعل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وہ دلائل جن کے باعث اس نے پہلا کام کیا ہے اُسے یاد آجائینگے۔ اور اس کا اعتراض دوسرے کام پر سے خودبخود اُٹھ جائیگا۔ اور اس جواب سے ہر ایک شخص جو اس کا ہم خیال ہوگا۔ وہ بھی تسلی پالیگا۔ اور بجائے اسکے کہ ہم اسکو اپنے فعل کے دلائل دیں خود اس کا ذہن اسکے سامنے حقیقی دلائل پیش کردیگا۔ پس اس الزامی جواب میں اور حقیقی جواب میں یہی فرق ہے۔ کہ اس جواب کے ذریعہ سے خود معترض کے منہ سے اپنے فعل کے مستحسن ہونے کا اقرار کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور بجائے دلائل کو کاغذ پر لاکر اس کے سامنے پیش کرنے کے خود اسی کے دماغ میں ایسی حرکت پیدا کردی گئی ہے کہ خود ہی دلائل اس کے سامنے آجاویں۔

اسلامی اخوت کا مطلب

خواجہ صاحب نے جوابوں کی نسبت الزامی ہونے کا الزام قائم کر کے سب سے پہلے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام نے اخوۃ قائم کی ہے۔ اسلئے جو مساوات اخوت میں ہوتی ہے وہی بنی نوع انسان میں قائم ہونی چاہیئے۔ اگر خواجہ صاحب کا یہ منشا ہے کہ اسلام کے رو سے تمام بنی نوع انسان اپنی پیدائش میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یا یہ کہ انکو ایک دوسرے کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اور ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیئے۔ تو یہ سچی بات ہے۔ اس کا کسی کو انکار نہیں۔ لیکن اگر خواجہ صاحب کا اس سے زیادہ کچھ اور مطلب ہے تو وہ اس آیت سے نہیں نکلتا۔ کیونکہ باوجود اس تعلیم کے اسلام نے حقیقی بھائیوں اور دوسرے لوگوں میں فرق کیا ہے۔ پس جب تک اس آیت کو ان آیات و احکام کے ماتحت نہ لایا جائیگا۔ جن سے اس مسئلہ کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ اس آیت کو عام کر کے کامل مساوات کا ثبوت نکالنا غلط ہے۔

اسلام میں مرد و عورت کے حقوق

اس سے آگے خواجہ صاحب نے عورت اور مرد کی عدم مساوات کا سوال اٹھایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہی ایک فرق ہے۔ جسے عدم مساوات کے حق میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اسلام نے اس فرق کو بھی مٹا دیا ہے۔ اور عورت اور مرد کے حقوق کو مساوی قرار دیا ہے۔ لیکن یہ دعویٰ خواجہ صاحب کا بالکل خلاف احکام اسلام ہے۔ اسلام نے ہر رنگ میں عورت اور مرد کے حقوق کو مساوی نہیں رکھا۔ بلکہ احکام کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ احکام ہیں جو مرد و عورت کی انسانیت کو مدنظر رکھ کر دئیے جاتے ہیں۔ اسمیں دونوں کو مساوات دیگئی ہے اور دونوں فریق کے لئے ایک قسم کے حکم ہیں مثلاً نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ وغیرہ دونوں احکام میں مرد و عورت شامل ہیں۔ اور دونوں کو یکساں ثواب ملنے کا وعدہ ہے یہ نہیں کہ عورت صرف مرد کا کھلونا ہو۔ بلکہ اسے اس مقصد عالی کے حصول کے لئے جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح مکلف کیا گیا ہے۔ جس طرح مرد کو۔ مگر وہ احکام جو انتظام اور سیاست کے متعلق ہیں۔ ان میں مرد اور عورت میں امتیاز کیا گیا ہے۔ اور مرد کو عورت پر فضیلت دیگئی ہے۔ اور اگر اس تقسیم کو اسلام قائم نہ کرتا تو اسلام دین فطرت ہو ہی نہ سکتا تھا۔ یہ فرق صرف اسلام نے ہی قائم کیا ہے۔ اور کسی مذہب نے قائم نہیں کیا اور یہ ایک فضیلت ہے۔ جو اسلام کو دوسرے مذاہب پر حاصل ہے۔ ایک طرف تو وہ مساوات قائم کرتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ کہ کوئی انتظام بلا اسکے نہیں چل سکتا کہ مختلف شرکاء میں سے ایک کی آواز کو سب کی آواز پر مقدم کیا جائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالے مردوں کی نسبت فرماتا ہے۔ کہ الرجال قوامون علی النساء۔ یعنی مرد عورتوں کے اوپر نگران ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان فرمادی کہ بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم یعنی اسلئے انکو نگران مقرر کیا گیا ہے کہ انسانی خلقت مرد کو نگرانی کا حق دیتی ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے مرد کو ایسے قوئے ملے ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ اشتراکی معاملات میں اس امر کا مستحق ہے کہ اس کی آواز انتظام میں آخری آواز ہو۔ اور بوجہ اسکے کہ مرد کے ذمہ مال کا خرچ کرنا ہے۔ اور یہ ایک تسلیم شدہ اصل ہے کہ مال کا خرچ کرنا جس کے ذمہ ہو اسکی آواز کو زیادہ وزن دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس شخص کیلئے نقصان کے احتمال زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر مرد جسمانی طور پر بھی گھر کے کام کاج میں کچھ نہ کچھ حصہ لیتا ہے۔ پس چونکہ مرد پر ذمہ داری زیادہ ہوتی ہے اسکے حقوق بھی زیادہ رکھے گئے ہیں۔ اسی طرح سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجۃ۔ یعنی عورتوں کو بھی مردوں پر ویسے ہی ضروری حقوق حاصل ہیں۔ جیسے کہ مردوں کو اور مردوں کو انپر ایک فضیلت ہے۔ اسمیں اسی اصل کو بیان کیا گیا ہے۔ جو میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ایک پہلو سے مساوات قائم کی گئی ہے۔ اور دوسرے پہلو سے مرد کو حاکم بھی قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت کے متعلق یہ اختیار بھی دیا ہے کہ اگر وہ نشوز کرے اور کسی طرح اس کی اصلاح نہ ہو۔ تو اسکو مارو۔ بیشک یہ کہا جا سکتا ہے کہ نشوز کی حالت میں ہی ایسا اختیار دیا گیا ہے۔ اسکے بغیر تو نہیں دیا گیا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر مرد نشوز کرے تو کیا قرآن و حدیث نے عورت کو بھی حق دیا ہے۔ کہ وہ بھی مرد کو مارے۔

پھر مرد کی جسمانی قوتوں کی زیادتی اور اس کے صاحب نفوذ ہونے کے سبب سے ہی مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت دی ہے۔ نکاح کے معاملہ میں بھی مرد کو اجازت دی ہے کہ وہ خود پسند کر کے نکاح کرے۔ لیکن عورت کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ اس کی رضامندی کے ساتھ اسکے والد یا کسی اور قریبی رشتہ دار کی رضامندی بھی ضرور لی جائے۔ اور اسی کی معرفت نکاح ہو۔

• عورت کے لئے نفلی روزہ تک رکھنے کے لئے خاوند سے اجازت لینے کا حکم دیا۔ لیکن مرد کے لئے گو یہ ہدایت کی کہ وہ اسقدر روزہ نہ رکھے کہ عورت کے حقوق ادا کرنے سے قاصر ہو جائے لیکن روزہ رکھنے کے لئے عورت کی اجازت شرط نہیں رکھی۔

مرد و عورت میں ہر رنگ میں مساوات نہیں

غرض اس قسم کے بہت سے احکام ہیں جنمیں عورت کو مرد کی رائے کے تابع کیا گیا ہے۔ مگر یہ امور وہی ہیں جو انتظامی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ احکام جو افراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں دونوں کو برابر رکھا ہے۔ دونوں کیلئے یکساں احکام اور نواہی ہیں۔ دونوں کو یکساں اپنی اموال کا مالک مقرر کیا ہے۔ دونوں کو یکساں اپنی جان کے متعلق اختیار دئے ہیں۔ پس یہ کہنا کہ ہر رنگ میں مرد و عورت میں مساوات ہے۔ غلط ہے بعض لحاظ سے مساوات ہے اور بعض لحاظ سے نہیں۔ اور مساوات کو وہیں مٹایا گیا ہے کہ جہاں مساوات کا مٹانا کام کے بخوبی چلانے اور امن کے قیام کے لئے ضروری تھا۔ اور ایسے موقعہ پر مرد کو عورت کے حقوق کا پوری طرح خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ مگر حکم مرد ہی کے سپرد کیا گیا ہے۔

شاید اسجگہ یہ کہا جائے کہ ہماری بھی حریت و مساوات سے یہی مراد تھی۔ مگر میں کہوں گا کہ میں نے بھی تو مراد دریافت کرنے کے لئے ہی سوال کیا تھا۔ پہلے مراد بیان کر دی تھی۔ اور پھر میرا خیال معلوم کر کے مضمون لکھنے بیٹھنا تھا۔

کیا وراثت میں مرد و عورت کے مساوی حقوق ہیں

خواجہ صاحب نے عورتوں کے حقوق کے متعلق ایک عجیب نکتہ لکھا ہے اور وہ یہ کہ عورت اور مرد کے حقوق وراثت میں بھی مساوی ہیں کیونکہ اگر عورت اپنے باپ کے مال میں سے آدھا حصہ لیتی ہے تو اپنے خاوند کی بھی وارث ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ کلید دیکھ کر آیات لکھنے کے عادی

ہیں۔ اور جس طرح سے زرا انھوں نے اپنے مضمون میں آیات لکھی ہیں۔ ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قرآن کریم کے مطالب کے سمجھنے کی انھوں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے یہ خیال کیا کہ اگر عورت اپنے خاوند کی وارث ہوتی ہے تو خاوند بھی اپنی عورت کا وارث ہوتا ہے اور وہ بھی اسی طرح کہ جسقدر حصہ عورت کو خاوند کے ترکہ سے ملتا ہے اس سے دُگنا مرد کو اپنی بیوی کے ترکہ سے ملتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ مرد عورت سے ہمیشہ پہلے ہی مرے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ولکم نصف ما ترک ازواجکم ان لم یکن لهن ولد فان کان لهن ولد فلکم الربع مما ترکن من بعد وصیة یوصین بها او دین ولهن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد فان کان لکم ولد فلهن الثمن مما ترکتم من بعد وصیة توصون بها او دین۔ جو کچھ تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں۔ اسمیں سے نصف تمہارا حصہ ہے۔ اگر ان کی اولاد نہ ہو۔ اور اگر ان کی اولاد ہو تو چوتھا حصہ تمہارا ہے وصیت کے حصہ یا قرض کے وضع کرنیکے بعد۔ اسی طرح عورتوں کے لئے تمہارے مال میں سے چوتھا حصہ ہے اگر تمہارے اولاد نہ ہو اور آٹھواں اگر اولاد ہو۔ یہ حصہ بھی تمہاری وصیت یا قرضہ کی ادائگی کے بعد جو مال بچے۔ اسمیں سے ہو گا۔

خواجہ صاحب اس آیت کو دیکھیں اور سوچیں کہ ان کی دلیل وراثت کے مساوی ہونے کی کہاں گئی۔ اگر عورت خاوند کے مال کی وارث ہوتی ہے۔ تو خاوند بھی عورت کے مال کا وارث ہوتا ہے۔ اور یہاں بھی اس کا حصہ دگنا ہوتا ہے۔ پس بہر حال مرد کا حصہ عورت کے حصہ سے دُگنا رہیگا۔ بلکہ دگنے سے بھی بعض صورتوں میں بڑھ جائے گا۔

ورثہ میں مرد و عورت کے حقوق مساوی نہ ہونے میں حکمت

یہ فرق جو مرد اور عورت کے حصہ میں شریعت نے رکھا ہے۔ اسکی وجہ اور ہے۔ اور یہ عدم مساوات ظالمانہ طور پر نہیں بلکہ ثابت شدہ حقایق کے ماتحت ہے۔

عورتوں اور مردوں میں مساوات ثابت کرنیکی کوشش کرنیکے بعد خواجہ صاحب نے اور کئی قسم کی مساوات احکام قرآنیہ سے ثابت کرنی چاہی ہیں اور بتایا ہے کہ اسلام نے مذہب میں مساوات قائم کی ہے کہ سب انسانوں کو اسلام کی دعوت دی ہے (۲) نسلی مساوات قائم کی ہے کہ عربی و عجمی اور بڑی اور چھوٹی ذاتوں کا فرق مٹا دیا ہے (۳) مالی مساوات قائم کی ہے۔ کہ کوئی شخص اپنے پاس ضرورت سے زیادہ مال نہیں رکھ سکتا۔

ہر امر میں مساوات نہ ہونے کا اعتراف

میں نہیں سمجھتا کہ ان دعاوی کے ثابت کرنے یا نا ثابت کرنیکی کوشش کرنے میں خواجہ صاحب کا کیا مقصد تھا۔ جس خط پر انہوں نے یہ سلسلہ مضامین لکھنا شروع کیا ہے۔ اس میں تو یہ سوال اُٹھایا گیا ہے۔ کہ ہر ایک بات میں حریت و مساوات نہیں۔ بعض جگہ حریت و مساوات بُری ہوتی ہے۔ بعض جگہ جائز اور بعض جگہ ضروری۔ پس ان امور میں اگر حریت و مساوات ثابت بھی ہو جائے تو اس کا فائدہ اور نفع؟ اصل مضمون پر کیا روشنی پڑیگی؟ میرے خط کی تردید تو تب ہو سکتی تھی کہ حریت و مساوات ہر رنگ میں ضروری ہوں اور یہ آپ نے خود تسلیم کیا ہے کہ ہر امر میں حریت و مساوات کا اصل قائم نہیں رہ سکتا۔ آپ لکھتے ہیں۔ ”اسمیں شک نہیں کہ حکومت کے باعث حکمران قوم کو ایک طرح کی فضیلت محکوم قوم پر حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس فضیلت کا مفہوم ایسی عدم مساوات نہیں ہے۔ جو غلامی کا مترادف ہے“ (وکیل ۱۴ر دسمبر ۱۹۳۰ء)

جب آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ہر جگہ حریت و مساوات کا اصل نہیں چل سکتا تو پھر اس سلسلہ مضامین کی کیا ضرورت تھی۔ یہی بات تو میں نے لکھی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ حریت و مساوات کا کوئی مفہوم ایسا ہو کہ وہ احکام اسلام میں شامل ہو جائے اور اس کا خیال رکھنا ضروری ہو جائے۔ اور ہو سکتا ہے۔ کہ اس کا خیال رکھنا صرف جائز ہو اور ہو سکتا ہے کہ منع ہو۔ آپ بھی یہی لکھتے ہیں کہ حاکم قوم کو ایک حد تک فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن محکوم قوم کی حالت غلامی تک نہیں پہنچنی چاہیئے۔ اور یہ کس نے لکھا تھا کہ محکوم قوم کے لئے اسلامی احکام کے مطابق غلام بن کر رہنے کا حکم ہے۔ یہ تو ایک خیال ہے جو خود ہی آپ نے پیدا کر لیا۔ اور خود ہی اس کا جواب دینے لگ گئے ہیں۔ میرا تو صرف اسقدر دعویٰ تہا کہ حریت و مساوات کا اصل ہر جگہ چسپاں نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کہ اس کی مختلف تعریفیں اور حد بندیاں کی جا سکتی ہیں۔ جنکے ماتحت اسکی تعریف یا مذمت کی جا سکتی ہے۔ آپ خود تشریح کرتے ہوئے اسی پھندے میں پھنس گئے۔ اور آپکو تسلیم کرنا پڑا کہ ہر جگہ اس کا استعمال نہیں ہو سکتا۔

سائل نے کونسی حریت و مساوات کے متعلق پُوچھا تھا

خواجہ صاحب کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سائل کا منشاء حریت و مساوات کے قیام سے اسی حریت و مساوات کا قائم کرنا تہا جو حاکم اور محکوم کے درمیان ہو۔ کیونکہ ان کا اشارہ حکومتوں کے تعلقات کے متعلق تہا۔ نہ کہ مغل اور سید اور راجپوت اور جاٹ کے فرق یا نجات کے عام ہونے کے متعلق اور اسی امر میں عدم مساوات کے مٹانے کے متعلق انھوں نے اشارہ کیا تھا اور اسیوجہ سے میں ان سے تشریح چاہتا تہا کہ وہ جب صفائی سے ان الفاظ کے مفہوم کی تعیین کریں تو آپکی طرح ان کو بھی تسلیم کرنا پڑے۔ کہ حریت و مساوات کا مفہوم بھی محدود ہے۔ اور ایک حد تک حریت و مساوات کا خیال کر کے فضیلت اور درجہ کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اور اسکے بغیر دنیا کا امن قائم ہی نہیں رہ سکتا۔

اس اجمالی جواب کے بعد میں ان تینوں قسم کی حریت اور مساوات کے متعلق جو خواجہ صاحب نے قائم کی ہے۔ الگ الگ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔

مذہبی مساوات

پہلی مساوات خواجہ صاحب نے مذہب کی بیان کی ہے۔ اور اسمیں کچھ شک نہیں کہ یہ مساوات سب سے بڑی ہے۔ اور سب سے پہلے اسے اسلام ہی نے قائم کیا ہے لیکن اس مساوات کا ذکر کرنے سے خواجہ صاحب کی غرض نہ معلوم کیا ہے۔ جس شخص کے خط کا جواب یہ دیا ہے۔ اور جس کی وکالت کیلئے آپ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مساوات کو نہایت حقارت سے دیکھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارے آقا اور راہنما حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ و علیٰ آلہٖ وسلم کے بعد ایک ہی شخص ہوئے ہیں۔ جنھوں نے اس مسئلہ پر اسقدر زور دیا ہے۔ جو اس کی عظمت کے مطابق تہا۔ اور ہماری جماعت ہی وہ جماعت ہے۔ جو اس مساوات کو عملی طور پر قائم کرنے کے لئے ہمہ تن کوشاں ہے اور گورے اور کالے کو اسلام کی طرف بلا رہی ہے۔ اور اس کی دعوت کر رہی ہے۔ پھر ہمیں یہ مساوات یاد دلانی کیا معنی رکھتی ہے۔ ہم سے زیادہ اس مساوات پر کسے یقین ہے۔ اور کس کے دل میں ہم سے زیادہ اسکی قدر ہے۔ یہ مساوات تو خواجہ صاحب کو ان صاحب کو یاد دلانی چاہیئے تھی۔ جن کی وکالت کیلئے وہ کھڑے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ اس مساوات کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مجھ پر طعن کرتے ہیں کہ کیا سال بھر میں ایک دو آدمیوں کا اسلام میں شامل کر لینا ہی اشاعت اسلام ہے

اور ان کے نزدیک اس اسلام کی امتیازی خصوصیت سے فائدہ اٹھانا اور اسلام کا ہر گھر کے دروازہ تک پہنچانا کچھ حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ جب تک مسٹر گاندھی کی تقلید میں ہندوستان کا امن برباد کرنے اور بچوں کو مادر پدر آزاد بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔

نسلی امتیاز مٹا کر مساوات قائم کرنا

دوسری قسم کی مساوات خواجہ صاحب نے نسلی امتیاز کا مٹانا بتائی ہے اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے اس مساوات کو بھی قائم کیا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی بات ہے کہ یہ مساوات دوسری عدم مساوات کو باطل نہیں کر سکتی۔ مثلاً اگر ایک خاص قوم اپنے علم یا حکومت کی وجہ سے دوسری قوم پر برتری رکھتی ہے تو اس مساوات کی بناء پر اس کی برتری کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی دوسری اقوام پر فضیلت کا بار بار ذکر فرمایا ہے۔ اور یہ فضیلت ان کو اس زمانہ میں اپنی تجربہ کاری اور رسوخ کی وجہ سے کل عرب کی اقوام پر ضرور حاصل تھی۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا۔ یعنی جو لوگ جاہلیت میں معزز سمجھے جاتے تھے۔ اب بھی معزز سمجھے جاویں گے۔ اگر دین کے واقف ہو جاویں۔ پس نسلی امتیاز کو گو اسلام نے مٹایا ہے مگر یہ اجازت نہیں دی کہ اس دلیل کی بناء پر کسی قوم کے ایسے امتیازات کو بھی مٹا دیا جائے۔ جو اسے کسی اور وجہ سے حاصل ہو چکے ہوں۔ مثلاً خود قرآن کریم نے نبوت و کتاب کے فیضان کو آل ابراہیم میں مخصوص کر دیا ہے۔ اور جیسا کہ فرماتا ہے۔ وجعلنا فی ذریتہ النبوۃ والکتاب۔ یعنی ہم نے اسکی اولاد میں نبوت اور کتاب مقرر کر دی۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ نسلی امتیاز چونکہ منع ہے۔ اسلئے یہ حکم بھی ناجائز ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیضان اسلئے حضرت ابراہیم کی نسل کے لئے خاص نہیں کیا گیا کہ وہ کسی خاص قوم میں سے تھے۔ بلکہ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی نیکی کو دیکھ کر ان کے ساتھ ایک دائمی عہد باندھ دیا تھا جس میں دوسروں کا کوئی نقصان نہ تھا اور حضرت ابراہیم کی عزت افزائی تھی۔ دوسروں کا نقصان اسلئے نہیں کہ ان کیلئے بھی ترقی کے تمام دروازہ کھلے ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اس فیضان کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ کوئی شخص حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے ایک مہر تاباں سے روشنی لئے بغیر بارگاہ الٰہی تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔

کیا اسلام نے مالی مساوات قائم کی ہے

تیسری قسم کی مساوات خواجہ صاحب نے مالی مساوات بتائی ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے یہ احتیاط کی ہے کہ غرباء کے ترقی کرنے کے راستے بند نہ ہو جاویں۔ اور کوئی ایسی روک ان کی ترقی کے راستہ میں نہ آ جاوے۔ جسکے سبب سے وہ آگے بڑھ ہی نہ سکیں۔ لیکن یہ استدلال کہ اسلام نے اموال کے جمع کرنے سے منع کیا ہے۔ اور زائد مال کے تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے ایک ظلم عظیم ہے۔ اور اسلام کی تعلیم میں ایک خطرناک تحریف ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے۔ جو اسلام میں تفرقہ اور شقاق ڈالنے کا سب سے پہلا ذریعہ بنایا گیا تھا۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت عثمان رضؓ کے زمانہ میں مفسدوں نے اسی خیال کو لوگوں میں پھیلانا شروع کیا تھا کہ صحابہ میں بڑے بڑے مالدار ہیں۔ اور دوسروں کے حقوق مار کر یہ لوگ مالدار ہو گئے ہیں۔ اور اس خیال کو تقویت دینے کے لئے ان لوگوں نے حضرت ابوذر رضؓ کو آلہ بنایا تھا۔ حضرت ابوذر رضؓ ایک غریب مزاج آدمی تھے۔ اور زیادہ مال پاس رکھنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر وہ دوسروں کو بھی کچھ نہیں کہتے تھے۔ ان شریروں نے ان کو جا کر اکسایا۔ کہ دیکھو لوگ کس طرح مال و دولت جمع کرنے میں لگ گئے ہیں۔ اور اسقدر ان کو جوش دلایا۔ کہ وہ سارا دن سونٹا لیکر اسی جستجو میں پھرتے رہتے۔ جہاں کوئی صحابی مالدار ملا۔ اسکو پکڑ بیٹھتے کہ تمہارے پاس مال کیوں ہے۔ اور لوگوں کو انھوں نے اسقدر دق کیا آخر حضرت عثمان رضؓ کو حکماً ان کو مدینہ بلوانا پڑا۔ اور آخر عمر تک وہ مدینہ کے پاس ایک گاؤں میں مقیم رہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کثرت سے سخاوت کیا کرتے تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ اسبات کا تعہد نہیں کیا کرتے تھے کہ ضرورت سے زیادہ مال کتنا ہے تا اُسے اسی وقت غرباء میں تقسیم کر دیں۔ یہ مسئلہ تو عبد اللہ بن سبا یہودی کا ایجاد کردہ تھا اور سوائے حضرت ابوذر رضؓ کے جو اپنی فقیرانہ طبیعت کے سبب سے اسکے اصل مطلب کو نہ سمجھ کر اسکے دھوکے میں آ گئے۔ اور کسی صحابی نے بھی اس عقیدہ کو تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ اسوقت انہیں بڑے بڑے صحابہ موجود تھے۔ جو حضرت ابوذر رضؓ سے زیادہ سابق اور زیادہ تفقہ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیادہ مقرب تھے۔

زکوٰۃ مقرر کرنیکی وجہ

باقی رہا یہ کہنا کہ اسلام نے زکوٰۃ کے نکالنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام مال کی تقسیم کا حکم دیتا ہے۔ ایک غلط استدلال ہے زکوٰۃ کے مسئلہ سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ غرباء کی مدد اسلام نے فرض مقرر کی ہے نہ یہ کہ مال کو تقسیم کرنا اسلام نے فرض مقرر کیا ہے۔ خود زکوٰۃ کی تعیین ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ مال کی تقسیم شریعت نے مقرر نہیں کی۔ کیونکہ زکوٰۃ تو مثلاً مال پر چالیسواں حصہ ہوتی ہے۔ اور زراعت پر عشر۔ اور نصف عشر ہوتی ہے۔ لیکن آمد اس نسبت سے زیادہ ہوتی ہے۔ تو یہ تقسیم مساوات رکھنے والی کہاں ہوئی۔ پھر زکوٰۃ آگے کئی آدمیوں میں تقسیم ہو گی۔ کچھ عملہ زکوٰۃ پر خرچ ہو جاویگی۔ پس زکوٰۃ کے مسئلہ سے مال میں مساوات رکھنے کا مسئلہ ثابت کرنا ایک سخت تعدی ہے۔

عفو کے کیا معنی ہیں

خواجہ صاحب نے اپنے اس دعوٰی کی تصدیق میں کچھ آیات بھی لکھی ہیں۔ اور جس طرح تمام مضمون میں انھوں نے صرف آیات کے درج کرنے سے غرض رکھی ہے۔ یہ نہیں دیکھا کہ وہ آیات وہاں چسپاں بھی ہوتی ہیں یا نہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی کیا ہے۔ کئی آیات اس مضمون کی درج کی ہیں۔ کہ جو کچھ تم کو خدا تعالیٰ نے دیا ہے۔ اسمیں سے خرچ کرو۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں میں سے غرباء کو بھی حصہ دینا اور بات ہے۔ اور اپنی اخراجات نکالکر غرباء کو باقی مال تقسیم کر دینا اور بات ہے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کئی آیات اس امر کے متعلق نقل کردی ہیں کہ جنگوں میں حاصل شدہ مال کس طرح تقسیم کرنے چاہئیں۔ حالانکہ ان اموال کا زیر بحث مسئلہ سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ صرف ایک آیت ہے۔ جس سے کچھ استدلال ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ ویسئلونک ماذا ینفقون قل العفو۔ عفو کے کئی معنی ہیں۔ جنمیں سے ایک معنی زیادہ کے بھی ہیں۔ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہدے کہ جو بچ جائے اسے خرچ کرو۔ بعض لوگوں نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ اس میں جو مال بھی ضرورت سے زائد ہو۔ اس کے خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن یہ معنے روایت اور

درایت دونوں کے خلاف ہیں۔ مفسرین نے اس آیت کے کئی معنے لکھے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسجگہ جہاد میں اموال خرچ کرنے کا حکم ہے۔ صدقات مراد نہیں۔ اس صورت میں اسکے یہ معنے ہونگے کہ جب جہاد درپیش ہو۔ تو اپنی ضروریات سے زائد مال تمام کا تمام جہاد کے لئے دیدو۔ اور ان معنوں سے مساوات ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ مال غربا میں تقسیم نہ کیا جائیگا۔ بلکہ دشمن کے مقابلہ میں خرچ ہوگا۔ دوسرے معنے اسکے یہ کئے جاتے ہیں کہ یہ جہاد کا ذکر نہیں۔ بلکہ صدقات کا ذکر ہے۔ جو لوگ صدقات کا ذکر بتاتے ہیں۔ وہ بھی اس آیت کے کئی معنے کرتے ہیں۔ بعض تو کہتے ہیں کہ عفو کے معنے ضرورت سے زائد بچے ہوئے مال کے ہیں۔ شروع اسلام میں سال بھر کے نفقہ سے جو بچ رہے۔ اسکے فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا حکم تھا۔ مگر آئندہ زکوٰۃ کے نازل ہونے پر یہ حکم موقوف ہو گیا۔ ان لوگوں کے نزدیک گویا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ نہیں یہ زکوٰۃ کے متعلق حکم ہے اور مجملاً بیان ہوا ہے۔ اسکی تفصیل دوسری جگہوں سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک اور جماعت عفو کے معنے اس مال کے کرتی ہے۔ جس کا خرچ کرنا بوجھ نہ معلوم ہو۔ اور جس کے خرچ کرنے سے جائداد تباہ نہ ہو جائے۔ بعضوں نے کہا کہ اسکے معنے درمیانی خرچ کے ہیں یعنی نہ بالکل کم خرچ کرو نہ حد سے زیادہ خرچ کرو۔ اور بعضوں نے کہا کہ عفو کے معنے بہتر اور پاک مال کے ہیں۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ اچھے اور پاک مال میں سے خرچ کرو۔ یہ نہ خیال کرو کہ پرانی اشیاء یا دوسروں کے مال اٹھا کر دیدو تو تم صدقہ کے حکم کے بجالانیوالے ہو جاؤ گے۔ بعضوں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ صدقہ اور خیرات خوب دل کھول کر کرو۔

ضرورت سے زائد مال تقسیم کردینے کا اسلام نے حکم نہیں دیا

ان تمام معانی سے جو مفسرین نے کئے ہیں۔ آپکے معنوں کی تصدیق نہیں ہوتی۔ جس جماعت نے اس آیت کے یہ معنے کئے بھی ہیں کہ جو ضرورت سے زائد بچے اسے خرچ کر دو۔ اس نے بھی یا تو اسے جہاد پر چسپاں کیا ہے یا منسوخ قرار دیا ہے۔ اور وہ اسبات پر مجبور بھی تھے۔ کیونکہ وہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے عمل کو اور امارت اسلامیہ کے طریق کو اسکے خلاف دیکھتے تھے۔ احادیث نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی اسی بات کی تائید فرماتی ہیں کہ اکثر اخراجات نکالکر باقی مال تقسیم کر دینا اسلامی حکم نہیں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یجیئ احدکم بماله کله یتصدق به ویقعد یتکفف الناس انما الصدقة علے ظہر غنی تم میں سے بعض اپنا سارا مال صدقہ کے لئے لے آتے ہیں اور پھر لوگوں کے آگے سوال کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ صدقہ زائد مال سے ہوتا ہے۔ اسی طرح فرماتے ہیں کہ لأن تذر ورثتك اغنياء خير من ان تذرهم عالة يتكففون الناس یعنے اگر تو اپنے ورثا کو دولتمند چھوڑ جائے تو یہ اچھا ہے بہ نسبت اسکے کہ تو انکو غریب چھوڑ جائے کہ لوگوں کے آگے سوال کیلئے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ اسی طرح حدیث صحیح میں آتا ہے کہ سعد بن ابی وقاص نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے دو ثلث مال کے تقسیم کر دینے کی اجازت چاہی۔ مگر آپ نے اس سے منع فرمایا۔ پھر انہوں نے آدھا مال تقسیم کر دینا چاہا۔ تو اس سے بھی منع فرمایا۔ پھر انہوں نے تیسرے حصہ کے تقسیم کر دینے کی اجازت چاہی تو اس حصہ کی آپنے اجازت دیدی مگر ساتھ ہی فرمایا۔ الثلث والثلث كثير یعنی تیسرے حصہ کی وصیت کردو

گورنمنٹ بھی بہت ہے۔

غرض یہ خیال کہ اسلام کا یہ حکم ہے کہ جو مال ضرورت سے زائد بچے اسے تقسیم کر دینا چاہئیے بالکل خلاف اسلام اور خلاف عمل صحابہ ہے کہ جنہیں سے بعض کی وفات پر لاکھوں کروڑوں روپیہ انکے ورثاء میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اور اگر یہی حکم تھا تو پھر زکوٰۃ کا حکم دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ جب سب مال جو ضرورت سے زائد ہو تقسیم کر دینے کا حکم ہے تو پھر زکوٰۃ کے مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

ضرورت سے زائد مال کی اصطلاح مبہم ہے

اور ضرورت سے بچے ہوئے کی اصطلاح خود مبہم ہے۔ بعض لوگ جو کچھ انکو مل جائے گو لاکھوں روپیہ کیوں نہ ہو۔ اسکو خرچ کر دیتے ہیں اور ضرورت سے زائد ان کے نقطۂ خیال میں کوئی مال ہوتا ہی نہیں۔ بعض لوگ اپنا سب مال تجارت وغیرہ میں لگائے رکھتے ہیں۔ ان کے پاس بھی ضرورت سے زیادہ نہیں بچ سکتا عقلاً بھی یہ خیال بالکل باطل ہے۔ کیونکہ جب تک ایک جماعت ایسے لوگوں کی نہ ہو جو مالدار ہوں عام ملکی بہبودی ہو ہی نہیں سکتی۔ اور غربا کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ بعض روحانی لوگ اپنے اموال کو حتی الوسع غرباء کی خدمت میں خرچ کرتے ہیں اور اسے اسلام نے منع نہیں کیا۔ بلکہ پسند کیا ہے۔ مگر یہ بات غلط ہے کہ اسلام نے اس امر کا حکم دیا ہے کہ دنیا میں مالی مساوات قائم کی جاوے۔ اور ضرورت سے زیادہ مال لوگ ضرور ہی خرچ کر دیں اگر یہ اصل تسلیم کیا جائے۔ تو یہ اصل بھی مقرر کرنا پڑیگا کہ ضرورت سے مراد عام حالت ملکی کے مطابق اخراجات ہونگے۔ ورنہ اگر اسبات کی اجازت دیدی جائے کہ ہر شخص اپنی ضرورت کا خود فیصلہ کرے تو پھر بھی مساوات نہیں رہیگی کوئی شخص اعلیٰ سے اعلیٰ کھانوں اور عمدہ سے عمدہ کپڑوں اور وسیع اور کھلے اور آراستہ اور پیراستہ مکانوں اور خوشنما چمنوں اور میوہ دار باغوں کے لئے روپیہ رکھ کر باقی اگر بچیگا تو غربا میں بانٹ دیگا اور غریب بیچارے گاڑھا پہننے اور جھونپڑیوں میں رہنے پر مجبور ہونگے۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام کے احکام کے مطابق یہ فرض ہے ہر مسلمان حکومت کا کہ اس کے ملک کے باشندہ فاقہ نہ رہیں اور ان کے قابل ستر مقامات کے لئے کپڑا مہیا کیا جائے۔ گویا انسانی زندگی کی حفاظت پوری طرح ہو۔ اس کیلئے وہ امراء سے مطابق حکم شریعت مال لیکر غرباء پر خرچ کرتی ہے اس سے زیادہ جو کچھ خرچ کیا جائے وہ امراء کی اپنی مرضی پر ہے۔ اگر نہ کریں تو جرم نہیں۔ ہاں اگر زکوٰۃ دینے کے بعد بھی ایک شخص فاقہ پر مرتا ہوا کسی کو نظر آئے تو اس کا فرض ہے کہ اس کی جان بچانے کی کوشش کرے۔

اس دعویٰ کا ثبوت اس حدیث سے ملتا ہے جو میں پہلے نقل کر چکا ہوں کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کیا ہے تو آپنے اسے اسلام کے اصولی احکام بتائے اور ان میں زکوٰۃ کا مسئلہ بھی بیان کیا۔ سب کچھ سنکر اس شخص نے کہا کہ میں اس سے نہ زیادہ کرونگا نہ کم۔ اسپر آپ نے فرمایا کہ اگر اس نے اس قول کو پورا کر دیا تو کامیاب ہو گیا۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غربا کی مدد کیلئے زکوٰۃ سے زیادہ دینا فرض نہیں۔ اگر کوئی زیادہ دے تو یہ اسکی مرضی پر منحصر ہے۔

غنیمت اور فے کے مال کی تقسیم میں مساوات کہاں ہے

کو ہ مبارک نے تقسیم اموال میں مساوات ثابت کرنے کے لئے غنیمت اور فے اور نفل کے متعلق چند آیات بھی لکھی ہیں۔ لیکن معلوم

ان سے کیا نتیجہ نکالا ہے۔ غنیمت کے متعلق انہوں نے یہ آیت لکھی ہے۔ واعلموا انما غنمتم من شیء فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمسٰکین وابن السبیل۔ یعنی یاد رکھو کہ جو مال تم کو جنگ میں ملیں۔ انہیں سے پانچواں حصہ خدا اور اسکے رسول اور قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کیلئے ہے۔ اس آیت سے اگر کوئی حکم نکلتا تھا تو صرف یہ کہ اسلام نے ہر ایک موقعہ پر غربا کی مدد کو مدنظر رکھا ہے۔ اور حکماً ان کیلئے ایک حصہ اموال کا علیحدہ کر دیا ہے۔ نہ یہ کہ مال کی تقسیم میں مساوات رکھی ہے۔

اسی طرح ایک آیت نفل کے متعلق لکھی ہے۔ کہ قل الانفال للہ والرسول۔ کہ انفال اللہ اور اسکے رسول کے لئے ہیں۔ اس سے معلوم انہوں نے تقسیم اموال میں مساوات کا مسئلہ کہاں سے نکال لیا ہے۔ کیونکہ اسمیں تو یہ بتایا گیا ہے کہ انفال خدا اور اسکے رسول کے ہیں نہ یہ کہ انفال کل بنی نوع انسان میں برابر تقسیم ہونے چاہئیں۔ اس آیت میں تو لوگوں کے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ انفال کیونکر تقسیم ہونگے۔ اللہ تعالیٰ نے انکو جواب دیا ہے کہ یہ خدا اور اسکے رسول کا کام ہے کہ جنگ میں آنیوالے اموال کو تقسیم کریں۔ تم حکومت کے معاملات میں دخل کیوں دیتے ہو۔ اپنی اصلاح کی فکر کرو اور ان باتوں میں نہ پڑو۔

ایک آیت خواجہ صاحب نے فے کے متعلق لکھی ہے۔ اس سے بھی میں نہیں سمجھا کہ مساوات کیونکر نکلتی ہے۔ آیت اسطرح ہے۔ ما افاء اللہ علیٰ رسولہ من اھل القریٰ فللہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمسٰکین وابن السبیل کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم۔ یعنی جو مال دشمن کا کہ بغیر جنگ کے قبضہ میں آئے وہ اللہ اور اسکے رسول اور قریبیوں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کا حق ہے۔ اس آیت میں مساوات کا کہاں ذکر ہے۔ اس سے تو صرف یہ نکلتا ہے کہ جس مال کیلئے جنگ نہ کرنی پڑے۔ خود بخود دشمن سونپ دے یا اور کسی طرح بلا لڑے قبضہ میں آجائے وہ بطور حق کے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اشاعت اسلام اور امام اسلام اور اسکے قریبیوں اور غریبوں یتیموں اور مسافروں کیلئے حکومت ہی کے پاس رہیگا۔ انہیں لوگوں کے اموال کا کیا ذکر ہے۔ زید اور بکر کے مال کا تو یہاں ذکر ہی نہیں۔ اسمیں تو حکومت کے اموال کی تقسیم کا ذکر ہے اور کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم سے بتایا ہے کہ امرا کو یہ مال نہ دینا چاہیئے کیونکہ یہ مال حکومت کا ہے۔ اور بوجہ خود مالدار ہونیکے ان کا حق نہیں ہے کہ اس مال میں سے لیویں۔ اسجگہ بھی مساوات کا ذکر ہے نہ عدم مساوات کا۔ بلکہ ایک طرح تو کہہ سکتے ہیں کہ عدم مساوات ہو گئی کیونکہ ایک حصہ آبادی کو اس مال کے پانے سے محروم کر دیا گیا۔

جہاد کا بے تعلق ذکر اور حضرت مسیح موعود پر حملہ

خواجہ صاحب نے اپنے مضمون میں بلا کسی ظاہری تعلق کے جہاد کا بھی ذکر کر دیا ہے اور حضرت مسیح موعود پر حملہ کیا ہے کہ آپ جہاد کے مخالف تھے۔ لیکن علاوہ اسکے کہ یہ بات بالکل بے تعلق ہے غلط بھی ہے۔ حضرت مسیح موعود نے کبھی نہیں تحریر فرمایا کہ باوجود جہاد کا موقعہ ہونیکے جہاد جائز نہیں بلکہ یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ موقعہ جہاد کا نہیں کیونکہ جہاد کی شرائط اسوقت نہیں پائی جاتیں۔ مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ اس مضمون کا جہاد کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ خواجہ صاحب کے تمام مضمون کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریشان خیالات کا ایک طوفان اٹھا ہے جو انہوں نے کاغذ کی نذر کر دیا ہے۔ آیتیں ہیں تو ان کا اصل مضمون سے کچھ تعلق نہیں باتیں ہیں تو وہ مقصد سے دور۔ انکو تو خیر کسی وجہ سے جوش آگیا ہوگا مجھے ایڈیٹر صاحب وکیل پر تعجب ہے کہ باوجود ایک فہمیدہ اور تجربہ کار آدمی ہونیکے بلا نظر ثانی کرنیکے انہوں نے یہ مضمون شائع کسطرح کر دیا جس مضمون کو دیکھو وہی حال ازآسمان و ریسمان کی مثال ہے۔

خدا تعالیٰ کی شان میں گستاخی

میں مضمون ختم کرنے سے پہلے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ خواجہ صاحب نے اپنے مضمون میں مناسب ادب سے بھی کام نہیں لیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر بلاوجہ تو وہ لائے ہی تھے اللہ تعالیٰ کی نسبت بھی انہوں نے ایک جگہ ایسا لفظ استعمال کیا ہے جو سخت ہتک آمیز ہے لکھتے ہیں کہ مطلق العنان حکومت صرف اللہ تعالیٰ ہی کیلئے خاص ہے۔ مطلق العنان کے معنے ہوتے ہیں جسکی باگ چھوڑ دی جائے۔ اس قسم کا ذلت پر دلالت کرنیوالا لفظ اللہ تعالیٰ کیلئے استعمال کرنا ایک مومن کی شان سے بعید ہے۔ بیشک استعارہ اور مجاز کلام میں ہوتا ہے لیکن وہ لفظ جو انسانوں کیلئے بھی درحقیقت ہتک کا موجب ہوتا ہے خدا تعالیٰ کیلئے استعمال کرنا سخت تعجب انگیز ہے اگر خواجہ صاحب کی نسبت کوئی شخص مطلق العنان کا لفظ استعمال کرے تو وہ ضرور اسکو برا منائینگے۔ پھر معلوم خدا تعالیٰ کے لئے یہ لفظ انہوں نے کیوں استعمال کیا۔ مجازاً ہی کوئی لفظ استعمال کرنا تھا تو ایسا لفظ استعمال کرتے جو ظلم اور خود سری پر دلالت نہ کرتا۔

خواجہ صاحب کو نصیحت

آخر میں میں پھر خواجہ صاحب کو نصیحت کرتا ہوں کہ کسی کا مضمون بغور پڑھنے سے پہلے اس کا جواب دینے نہ بیٹھ جایا کریں اور قرآن پر زیادہ تدبر کی عادت ڈالیں۔ قرآن کریم کا مطالعہ نہ کرنا بھی عیب ہے۔ اور اس کا غلط استعمال اور اسکی آیات کو بے محل طور پر مضمون میں درج کرنا یہ بھی عیب ہے۔ میرے خط میں حریت و مساوات کی تمام اقسام کا انکار نہیں کیا گیا بلکہ سائل سے انکی تعریف پوچھی گئی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسبات کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ اسلام نے کس حد تک اور کن معنوں میں حریت و مساوات کی تعلیم دی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسکے احکام کے مطابق اسلامی حریت کے اس حصہ کو جس کا قیام میری ذات سے متعلق ہے قائم کرنیکی کوشش کرتا رہتا ہوں مگر سائل کے جوش اور تعصب کو دیکھ کر میں نے چاہا تھا۔ کہ اسکی حریت و مساوات کی جو غلط تعریف اسکے ذہن میں لکھی ہوئی ہے۔ اسکی تفصیل پہلے اسی کی قلم سے کہلوا لوں۔ پھر اسکو جواب دوں۔ آپ نے نہ اسکے جواب کا انتظار کیا نہ خود اسکے قائم مقام بنکر ان الفاظ کی تفسیر اپنے خیالات کے مطابق کی بلکہ ایک وہمی بات کا جواب دینے بیٹھ گئے۔ عقلمند انسان کا کام نہیں ہوتا کہ مبہم الفاظ کا جواب دے جب تک حریت و مساوات کی تعریف سائل نہ کر لیتا میرا حق نہ تھا کہ میں اسکے سوالات کا تفصیلی جواب دیتا ورنہ میرا فرض تھا کہ حریت و مساوات کی پہلے خود تشریح کرتا اور پھر اسے بتاتا کہ ان ان معنوں میں فلاں فلاں محل پر حریت و مساوات کا قائم کرنا اسلامی احکام کے مطابق ہے اور فلاں فلاں معنوں میں فلاں فلاں محل پر حریت و مساوات کا قائم کرنا دین یا عقل یا قواعد تمدن کے خلاف ہے۔ اور یہ طوالت ایک خط برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پس میں نے وہ طریق اختیار کیا جو اسموقعہ پر بہترین ہوتا ہے کہ خود سائل سے ہی دریافت کر لیا کہ وہ حریت و مساوات کے کن معنوں اور کس کس محل پر استعمال کے متعلق مجھ سے دریافت کرتا ہے جس جگہ بحث کا رنگ پیدا ہو یا بحث کا خطرہ ہو اسجگہ مبہم سوال کا جواب زیر بحث مسئلہ کو اور بھی الجھا دیا کرتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص کسی سے دریافت کرے کہ کیا کسی سے جبراً کوئی حکم منوانا بھی جائز ہے۔ اور وہ آگے سے جواب دیدے کہ نہیں تو اگلا آدمی اگر تو تعصب سے علیحدہ ہے اور جوش میں بھرا ہوا نہیں تو وہ اسکا مطلب سمجھ جائیگا لیکن اگر سائل غصہ کی حالت میں ہے اور دوسرے پر الزام قائم کرنیکی فکر میں ہے تو وہ آگے سے کہہ اٹھیگا کیا بچوں سے جبراً بات منوائی نہیں جاتی کیا حکومت بعض باتیں جبراً نہیں منواتی۔ کیا پاگلوں سے جبراً بات نہیں منوائی جاتی۔ اور خواہ مخواہ بات کو لمبا کر دیگا۔ چونکہ جن صاحب کے خط کا میں نے جواب لکھا ہے انکی طرز تحریر سے بھی یہی ثابت ہوتا تھا کہ وہ محض الزام دہی کی فکر میں ہیں۔ اسلئے ان سے اسی قسم کا برتاؤ کیا گیا جسکے وہ مستحق تھے۔ اور پہلے انہی سے ان الفاظ کے معنے اور انکے استعمال کا محل دریافت کیا گیا تاکہ انکو جواب بھی انکی طرز دہی پر ثابت کر دی جائے۔

آخر میں میں خواجہ صاحب کو یہ بھی نصیحت کرتا ہوں کہ وہ بلا وسیع طور پر اسلام کے احکام پر نظر ڈالنے کے اسرار شریعت بیان کرنیکی کوشش نہ کیا کریں۔ اسرار شریعت بیان کرنا ان کا کام ہے جنکی نظر وسیع ہو۔ اب یہی بات جو مساوات کی حکمت جو انہوں نے بیان کی ہے اگر غیر مسلم لوگوں میں جا کر بیان کرنے بیٹھتے تو کس قدر ہنسی اور شرمندگی کی بات ہوتی۔ اگر خود پوری طرح کسی مسئلہ کا علم نہ ہو تو واقف کار لوگوں سے دریافت کر لینا چاہیئے اس میں ہتک کی کوئی بات نہیں۔ بالمسلم سے علم [illegible] وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

خاکسار مرزا محمود احمد

(باہتمام شیخ عبدالرحمٰن صاحب۔ ... پرنٹر و پبلشر ضیاء الاسلام پریس قادیان میں چھپکر مالکان کیلئے شائع ہوا)